جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

متکلمِ اسلام
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر چاہے
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

اے خضر مری راہ تو بس راہ جنوں ہے
منزل کو غرض ہو تو خود اس راہ پر آئے

"یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لیے نہیں اتری ہے؛ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اتری ہے؛ ہوا کے رخ پر اڑنے والے خس وخاشاک اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض، اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ یہ ان بہادروں اور شیروں کے لیے اتری ہے جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں؛ جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہیں؛ جو صبغۃ اللہ کو ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ مسلمان جس کا نام ہے وہ تو دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے، اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہی ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کردے جو اس کے ایمان واعتقاد میں راہ راست ہے۔ صراط مستقیم ہے۔ اگر دریا نے اپنا رخ اس راستہ سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوے میں ہر وہ شخص جھوٹا ہے جو اس بدلے ہوئے رخ پر بہنے کے لیے راضی ہو۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے وہ اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا، اس کا رخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کردے گا۔ کامیابی و ناکامی کی اس کو قطعاً پرواہ نہ ہوگی۔ وہ ہر اس نقصان کو گوارا کرے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو۔ حتیٰ کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں، اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہوجائیں اور پانی کی موجیں اس کو نیم جان کر کے کسی کنارے پھینک دیں، تب بھی اس کی روح ہرگز شکست نہ کھائے گی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کے اوپر بہنے والے کافروں اور منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائے گا۔"[18]

(سید مودودی)

سید ابوالاعلیٰ مودودی

خشتِ اول: سید ابوالاعلیٰ مودودی 25 ستمبر 1903 کو اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ آپ خاندان چشتیہ کے چشم و چراغ تھے۔ والد سید احمد حسن نے بچپن ہی سے ان کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ سید احمد حسن راتوں میں کم سن ابوالاعلیٰ کو پیغمبروں اور سلف صالحین کے قصے سناتے۔ علما و فضلاء دوستوں کی مجالس میں لے جاتے۔ قرآن اور دعائیں یاد کراتے۔ چار سال کی عمر سے ہی ہر نماز پڑھنے کے لیے مسجد لے جاتے۔ گھر کے اسی ماحول کا اثر تھا کہ ننھے ابوالاعلیٰ نے پہلا روزہ انتہائی کم عمری میں رکھ لیا تھا اور باوجود بڑوں کے بہلاؤں اور اصرار کے اسے نہیں توڑا۔ ان کے والد صاحب ان کی عادات اور زبان پر گہری نظر رکھتے، ایسے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتے جن کی عادتیں بگڑی ہوئی ہوں۔ اس کے باوجود کوئی بری عادت یا معیاری سطح سے گرا ہوا لفظ اگر ابوالاعلیٰ کہیں سے سیکھ لیتے تو ان کے ابا فوراً ٹوکتے اور اصلاح کرتے۔ ابوالاعلیٰ کسی غلط صحبت میں پڑ کر کوئی بری عادت یا گندی زبان نہ سیکھ لیں اس لیے ان کے ابا نے انھیں باقاعدہ کسی مدرسے میں نہیں ڈالا بلکہ گھر پر ہی ابتدائی تعلیم کا نظم کیا۔ گھر کی تعلیم کا فائدہ یہ ہوا کہ آپ کسی لگے بندھے نصاب کے تابع نہیں رہے بلکہ اپنی پرواز کے مطابق کتابوں پر کتابیں ختم کرتے چلے گئے اور نو برس کی عمر میں ہی عربی ادب و فقہ کی بنیادی کتابوں پر عبور حاصل کر لیا۔ اس کے بعد مدرسۂ فوقانیہ میں داخل ہوئے۔ یہیں پہلی بار انھیں مضامین لکھنے اور تقریریں کرنے کا اتفاق ہوا اور مدرسے سے الفت اتنی بڑھی کہ چھٹی کا دن گراں گزرنے لگا۔ بعد ازاں حیدر آباد کے دار العلوم میں داخلہ لیا اور 14 برس کی عمر میں مولوی کا امتحان پاس کیا۔

صحافت سے امامت تک: 1918 میں ابوالاعلیٰ مودودی اخبار مدینہ (بجنور) کے ادارتی عملے میں شامل ہوئے، پھر جبل پور سے شائع ہونے والے تاج کے مدیر بنے۔ یہ جریدہ اپنی آزاد خیالی اور انگریز دشمنی کی بنا پر چند ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ ابوالاعلیٰ مودودی دلی تشریف لائے اور ایک

استاد کی مدد سے انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ گو یہ سلسلہ چار پانچ مہینوں سے زیادہ نہیں چلا لیکن مولانا اس قابل ہو گئے کہ فلسفہ، تاریخ، سیاسیات، معاشیات، اور عمرانیات کی موٹی موٹی انگریزی کتب بالاستیعاب پڑھنے لگے۔ 1920 میں تاج دوبارہ جاری ہوا اور آپ ہی پر اس کی ادارت کی ذمہ داری آئی۔ خلافت تحریک اپنے شباب پر تھی۔ مولانا نے اپنی کئی سیاسی تحریروں میں انگریزوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے ایک مضمون کو خلاف قانون قرار دے کر حکومت نے تاج کے (قانونی طور پر) اڈیٹر، پرنٹر، پبلشر مولانا تاج الدین کے خلاف مقدمہ چلایا۔ اخبار بند کر دیا گیا۔ نوجوان ابوالاعلیٰ کو اس واقعے کا سخت افسوس ہوا۔ انھوں نے طے کر لیا کہ آئندہ اپنے قلم کے عواقب و نتائج کی پوری ذمہ داری وہ خود اٹھائیں گے۔

1920 کے اواخر میں مودودی ایک بار پھر دلی آئے، جمعیت علماء کے معززین مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید سے رسم و راہ رہی۔ اسی سال جمعیت علماء کی طرف سے جاری کردہ اخبار **مسلم** کی ادارت ان کے سپرد ہو گئی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر کچھ ہی دنوں میں مسلم کو بھی بند کرنا پڑا۔ مولانا مودودی حیدرآباد چلے گئے۔ 1924 کے اوائل میں واپسی ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر کی مردم شناس نگاہوں نے نوجوان مودودی کو تاڑ لیا۔ مولانا جوہر نے انھیں اپنے اخبار **ھمدرد** میں کام کرنے کی دعوت دی۔ لیکن اسی وقت جمعیت علماء کی طرف سے **الجمعیۃ** کا اجرا ہوا اور ادارت کے لیے لوگوں کی نگاہ انتخاب مولانا مودودی پر پڑی۔ یہاں آزادی سے کام کرنے کے امکانات زیادہ تھے لہٰذا مولانا مودودی الجمعیۃ سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں مولانا مودودی صرف اخبار نویسی نہیں کر رہے تھے بلکہ حالات کی نبض پر ان کا ہاتھ تھا۔ قوم کے وقتی جوش (خلافت تحریک) اور لیڈران کے عجیب و غریب نسخوں (ہجرت تحریک) نے انھیں بددل کر دیا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ یہ قوم کے درد کی دوا نہیں ہے۔ ان کا زیادہ تر وقت مسلمانوں کے لیے راہ نجات کیا ہو یہ سوچنے میں گزرتا تھا۔ مسلمانوں میں نہ جوش و حمیت کی کمی تھی نہ ان کے لیڈران میں خلوص و تقویٰ کی، پھر خرابی کہاں ہے یہ سوال ان کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔

1926 میں سوامی شردھانند کا قتل ہو گیا۔ چونکہ قاتل مسلمان تھا لہٰذا اسلام پر، جہاد پر ہر طرف سے تیشہ زنی ہونے لگی۔ ان اعتراضات کی بوچھاڑ پر مسلمانوں کا از خود مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہو جانا

اور صفائی پیش کرنا، جیسا کہ اس قسم کے موضوعات پر ہوتا آیا ہے (اور دہشت گردی کے موضوع پر آج بھی ہو رہا ہے) مولانا مودودی کو پسند نہ تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ اس فتنے کا ازالہ ایک بلند پایہ علمی و تحقیقی کاوش سے کریں گے جس میں اسلامی جہاد کا موازنہ ایک طرف تو دیگر مذاہب کے قوانین جنگ سے کیا جائے اور دوسری طرف جدید مغربی قوانین جنگ سے، اور ہر دو پر اسلام کی فوقیت خالص علمی و عقلی دلائل کی بنا پر ثابت کی جائے۔ اس مقصد سے انھوں نے پہلے **الجمعیۃ** میں اسلام کا قانون جنگ کے عنوان سے سلسلہ وار مضامین لکھنے شروع کیے پھر سلسلۂ مضامین کو اس موضوع کا متحمل نہ سیکھ کر باقاعدہ کتاب لکھنی شروع کی جو 1930 میں **الجہاد فی الاسلام** کے نام سے شائع ہوئی۔ اس موضوع پر کسی زبان میں اس سے بہتر اور مدلل کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔

اسی زمانے میں مسلمانوں کے سیاسی لائحہ عمل کو لے کر مولانا مودودی اور جمعیت علماء کے اختلافات نے شدت اختیار کر لی، مولانا نری آزادی کے قائل نہیں تھے بلکہ مکمل اسلام کا نفاذ چاہتے تھے۔ انھوں نے الجمعیۃ کی ادارت چھوڑی اور حیدرآباد آ کر تصنیف و تالیف کے کاموں میں لگ گئے۔ آپ نے علامہ شیرازی کی کتاب **اسفار الاربعہ** کے دو ضخیم حصوں کا ترجمہ کیا۔ معاوضے میں ملی رقم سے تفسیر، حدیث اور فقہ کی بنیادی کتب کے ساتھ ساتھ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا پورا سیٹ خرید لیا اور ایک ماہنامہ **ترجمان القرآن** کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالے کے ذریعے مولانا مودودی نے ان مسائل، ان افکار، ان پیچیدہ سوالوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا شروع کیا جو ایک عرصے سے ان کے ذہن کی تنگنائیوں میں قید تھے۔ اس رسالے کو وہ ایک زبردست انقلابی طاقت بنا دینا چاہتے تھے، وہ اپنے ساتھیوں کی تلاش میں تھے، ایسے ساتھیوں کی جو موجودہ نظام میں کسی جزوی ترمیم یا کسی پیوندکاری کے قائل نہ ہوں بلکہ سارے سسٹم کو توڑ پھوڑ کر پھر سے اسلامی اصولوں پر ایک نظام کی تعمیر کے خواہاں ہوں۔ مولانا 'ہمہ گیر باغی' ڈھونڈتے تھے اور شاکی تھے کہ انھیں ہر جگہ 'جزوی باغی' ملتے ہیں۔

اس دوران مناظر احسن گیلانی نے **جامعہ عثمانیہ** میں دینیات کی تعلیم دینے کے لیے مولانا مودودی کا نام پیش کیا۔ گو مولانا مودودی کی معاشی حالت دگرگوں ہی تھی اور اپنا سارا سرمایہ وہ ترجمان القرآن میں لگا چکے تھے لیکن انھوں نے انتہائی خطیر معاوضہ کے باوجود یہ پروفیسری قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کے بڑے بھائی نے نرمی اور سختی ہر طرح سے سمجھایا لیکن مولانا

مودودی اپنی ترجیحات متعین کر چکے تھے جو چند سکوں کے لیے بدلی نہ جاسکتی تھیں۔ اس موضوع پر بڑے بھائی سے ان کی گفتگو چھ سات گھنٹے تک دراز ہوگئی، آخر میں آپ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ''بھائی جان! حالات بہت نازک ہو چکے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جو سیلاب آنے والا ہے وہ 1857 والے انگریزی اقتدار کے سیلاب سے بھی کہیں زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوگا۔ مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اپنی ہمت کے مطابق میں ان کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنے کی کوشش کروں گا۔ اب وقت ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میری آواز میں خلوص رہا تو میرا جذبہ ناکام نہیں جائے گا۔''

اس دوران علامہ اقبال نے، جو مولانا مودودی کے رسالے کے قاری اور ان کے درد کے آشنا تھے، مولانا مودودی سے ان کے پنجاب منتقل ہونے کے تعلق سے خط و کتابت کی۔ دراصل پٹھانکوٹ میں ملت کا درد رکھنے والے ایک مسلمان نے ایک خطۂ زمین خدمت دین کے لیے وقف کر دیا اور اس بات کی خواہش کی کہ کچھ علماء دین یہاں جمع ہو کر دین کا کام کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اقبال سے مشورہ کیا تو موخر الذکر نے مولانا مودودی کا نام لیا۔ یوں ایک دار الاسلام کا خاکہ بنا اور مولانا مودودی 1937 میں پٹھانکوٹ منتقل ہو گئے۔ فروری 1939 کو آپ لاہور آ گئے۔ ستمبر سے آپ نے لاھور اسلامیہ کالج میں اعزازی طور پر دینیات کے لکچرز دینے شروع کیے۔ ان لکچرز کو کالج کے تمام طلبہ اور اساتذہ ایک ہال میں جمع ہو کر توجہ سے سنتے تھے۔ اسی زمانے میں آپ نے لکھنؤ، امرتسر، پشاور و دیگر علاقوں میں مختلف دینی اداروں کی دعوت پر تشریف لے گئے اور قیمتی مقالات پیش کیے۔

ملک میں انگریزوں کا چل چلاؤ تھا اور 'آزادی' کا خواب اب حقیقت بننے والا تھا۔ مولانا مودودی آزادی کے خلاف نہیں تھے۔ وہ ایک قدم آگے کی سوچ رہے تھے۔ وہ علماء اور قائدین سے یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ انگریز کے جانے کے بعد کیا؟ ان کے مطابق انگریز ہو یا ہندوستانی، غیر اسلامی حکومت باطل کی حکومت ہے، طاغوت کی حکومت ہے... اور ہر طاغوتی حکومت ظلم ہے، شر ہے، فساد ہے۔ ایک طاغوت کو دوسرے طاغوت سے بدل لینا کوئی 'مقصد' نہیں ہوسکتا، کم از کم امت مسلمہ کا تو ہرگز نہیں۔ کوشش تو یہ ہونی چاہیے کہ باطل کو حق سے بدل دیا جائے۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے سلسلۂ مضامین میں مولانا نے ایک طرف کانگریسیوں کو آڑے ہاتھوں لیا جو سیکولرزم،

ڈیموکریسی کے سراب کے پیچھے لپکے جاتے تھے تو دوسری طرف ان قوم پرست مسلمانوں پر ان کی غلطی واضح کی جو مسلمانوں کو عام معنوں میں ایک قوم تصور کر کے دوقومی نظریے کی بنیاد پر اپنے حقوق، اپنے مطالبات اور آخر کار اپنے ملک کی باتیں کرتے تھے۔

بالآخر مولانا مودودی نے سمجھ لیا کہ ان کی آواز اس نقار خانے میں کوئی نہیں سنے گا۔ انھیں احساس ہو گیا کہ زمانہ صرف فکری نہیں بلکہ عملی رہنمائی کا بھی طالب ہے۔ لہذا انھوں نے اپنے رسالے کے ذریعے یہ بات واضح کی کہ: ''دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے، صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔'' اگست 1941 میں لاہور میں 75 نیک سیرت اور فکر مند لوگوں نے مولانا مودودی کی آواز پر لبیک کہا اور یوں **جماعت اسلامی** کا قیام عمل میں آیا۔ گو تاسیسی اجتماع میں مولانا مودودی نے صاف صاف کہہ دیا کہ ان کی حیثیت صرف ایک داعی (کنوینر) کی سی ہے نہ کہ قائد کی لیکن انھیں ہی جماعت اسلامی کا امیر چن لیا گیا۔

شہادت گہہ الفت: بلا کم و کاست مکمل اسلام کو لے کر اٹھی اس تحریک، جماعت اسلامی نے پرامن دعوت کے ذریعہ اسلام کی حقانیت کو لوگوں پر واضح کرنا اور اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ 1940 کے دہے میں ملک فرقہ واریت کے اک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا تھا۔ ملک پر تقسیم کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں اپنوں اور غیروں کی مخالفت کے درمیان تحریک اسلامی کے اس مختصر کارواں کا سفر شروع ہوا۔ 1942 میں پٹھانکوٹ میں مرکز جماعت اسلامی دارالاسلام کا قیام ہوا۔ 1943 میں تین علاقہ وار اجتماعات ہوئے۔ 1945 اور 1946 میں کل ہند اجتماعات ہوئے۔ 1947 میں چار علاقہ وار اجتماعات ہوئے۔ اس دوران 533 افراد بطور رکن جماعت اسلامی سے وابستہ ہو کر اقامت دین کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکے تھے۔

اب ملک کی تقسیم ایک حقیقت بن کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ مدراس کے اجتماع میں ہی مولانا مودودی نے واضح کر دیا تھا کہ اب ملک کا یکجا رہنا ناممکن ہے اور تقسیم کی صورت میں جماعت اسلامی کے نظم کا ایک رہنا نہ صرف انتظامی دشواریوں بلکہ مختلف قسم کی غلط فہمیوں کا موجب بن سکتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں جماعت کے لائحہ عمل کے بارے میں کچھ بنیادی اشارات دیے اور یہ طے ہو گیا کہ

جماعت اسلامی ہند و پاک کے نظم علاحدہ کر دیے جائیں گے۔ مولانا مودودی اصولی طور پر تقسیم کے خلاف تھے، ساتھ ہی ساتھ قومیت کی بنیاد پر حاصل شدہ پاکستان کے تعلق سے کم از کم وہ اس قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا نہ تھے جو عام مسلمانوں میں پائی جارہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسلام کے نام پر قائم شدہ اس مملکت میں اسلامی نظام کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے پاکستان ہجرت کرنے کو ترجیح دی۔ اس اثنا فرقہ وارانہ فسادات کی آگ پوری شدت سے بھڑک اٹھی۔ اس آگ کے شعلے مرکز جماعت دارالاسلام پٹھانکوٹ میں بھی پہنچے اور مرکز پر حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ڈھائی ہزار پناہ گزیں وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مولانا مودودی نے کیمپ کے دفاع کا نظم کیا، مورچے تیار کیے اور سارے مردوں کو بندوق، لاٹھی، کلہاڑی جو کچھ میسر آیا وہ دے کر ان مورچوں پر بھیج دیا۔ خود ساتھیوں کے ساتھ بندوق سنبھالے پہرہ دیا۔ کچھ ہی دنوں میں لاہور سے رفقاء نے کچھ بسوں کا انتظام کر کے بھیجا، لیکن کیمپ کو غیر محفوظ چھوڑ کر خود پاکستان چلے جانے سے مولانا مودودی نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر عورتوں اور بچوں کو ان بسوں میں بھیج دیا گیا، مرد سب کے سب پناہ گزینوں کی حفاظت پر مامور رہے۔ بالآخر پاکستان کی حکومت نے ملٹری بھیج دی جس نے کیمپ کا چارج سنبھالا اور تب مولانا 30 اگست 1947 کو لاہور منتقل ہو گئے۔ آپ کچھ دن مہاجرین کے کیمپ میں رہے یہاں بھی ڈھارس بندھانے سے لے کر دعوت پھیلانے تک کا کام کیا۔

پاکستان میں نئے چیلنجز کا سامنا تھا۔ انگریز، کانگریس یا مہاسبھا سب بیرونی اور کھلے دشمن تھے لیکن پاکستان میں آستین کے سانپوں سے سابقہ تھا جو اسلام کا نام تو لیتے تھے لیکن عملاً مغرب سے مسحور و مرعوب تھے، سیکولر ڈیموکریسی کے قائل تھے یا آمریت کے دلدادہ۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد اسلامی نظام اور اس کے بنیادی تصورات و دیگر نظام ہائے حیات کے مقابلے میں اس کے تفوق پر مولانا مودودی نے ریڈیو پر ایک سیریز میں کئی تقریریں کیں۔ یوں مولانا شروع ہی سے حکومت کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے۔ 4 اکتوبر 1948 کو مولانا اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر لیا گیا۔ جماعت کے اخبار تسنیم پر پابندی لگا دی گئی۔ بغیر مقدمہ کی یہ قید بیس ماہ تک دراز ہوئی اور مولانا 28 مئی 1950 کو ہی رہا ہو پائے۔ رہائی کے بعد آپ نے ملک بھر کا دورہ کیا اور کوشش کی کہ ملک جس اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے وہ اسلام نافذ ہو اور ملک آمریت کے شر سے محفوظ رہے۔ حکومت نے اسلامی قانون لاگو نہ کرنے

کے لیے فقہی اختلافات کی پناہ ڈھونڈھ لی کہ: آخر 'کونسا' اسلامی قانون نافذ ہو؟ مولانا مودودی کی ایما پر مختلف مکاتب فکر کے جید علماء کراچی میں سر جوڑ کر بیٹھے اور بائیس دفعات پر مبنی اپنی بنیادی سفارشات پیش کر دیں۔ حکومت نے، دال گلتی نہ دیکھ کر پہلے حیلے اور ٹال مٹول کا انداز اپنایا اور بعد میں اسلامی دستور کی اس مہم کی کامیابی کے روشن امکانات دیکھ کر قادیانیت کے مسئلے کو ہوا دے دی۔ یہ فتنہ پھیلا اور فسادات نے زور پکڑا تو خود ہی قیام امن کے نام پر علماء کی دھر پکڑ شروع کر دی۔ 28 مارچ 1953 کو مولانا مودودی بھی ختم نبوت پر ایک کتابچہ لکھنے کی پاداش میں گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک اخباری بیان پر جرح سے پہلے مولانا کے وکیل نے مشورہ دیا کہ آپ صرف اتنا کہہ دیں کہ: میں ہر اخباری بیان کی حرف بہ حرف ذمہ داری نہیں لے سکتا اور باقی میں سب سنبھال لوں گا۔ لیکن مولانا مودودی نے اس خیر خواہانہ مشورے کو ماننے سے انکار کر دیا اور جج نے جب اس سلسلے میں استفسار کیا تو انھوں نے صاف فرمایا: میں اس کے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ 11 مئی کو مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ مولانا مودودی نے نہ صرف یہ کہ خود رحم کی اپیل کرنے سے صاف انکار کر دیا بلکہ گھر اور جماعت والوں کو ایسی کسی بھی حرکت سے منع کر دیا۔ جیل میں ملنے آئے اپنے معصوم بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھوں نے فرمایا، ''بیٹا ذرا نہ گھبرانا، اگر میرے پروردگار نے مجھے اپنے پاس بلانا منظور کر لیا ہے تو بندہ بخوشی اپنے رب سے جا ملے گا اور اگر اس کا ہی حکم ابھی نہیں تو پھر چاہے یہ الٹے لٹک جائیں لیکن مجھ کو نہیں لٹکا سکتے۔''

اس ظالمانہ سزا پر صرف پاکستان نہیں بلکہ دنیا بھر سے پرزور احتجاج کی ایک لہر اٹھی اور حکومت نے مجبور ہو کر پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کر دی، بعد ازاں 28 اپریل 1955 کو آپ رہا کر دیے گئے۔ 1956 میں پاکستان کا دستور بنا۔ اس دستور کی اسلامی شناخت جیسی کچھ بھی تھی اس میں مولانا مودودی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ دستور کی اسلامی شناخت کے حق میں مشرقی پاکستان کی رائے عامہ ہموار کرنا ضروری تھا کیونکہ وہاں سیکولر اور کمیونسٹ عناصر زیادہ مضبوط تھے۔ مولانا مودودی نے اسی مقصد کے لیے 24 جنوری 1956 کو چالیس دن کے دورے پر مشرقی پاکستان گئے۔

جون 1956 میں آپ نے دمشق میں منعقدہ موتمر عالم اسلامی میں شرکت کی، وہاں سے واپسی پر حج بیت اللہ اور زیارت مزار نبوی کی سعادت حاصل کی۔ 1950 کے اوائل ہی سے حکومت اور دیگر

شر پسند عناصر کی طرف سے مولانا مودودی کے خلاف ایک زبردست پروپیگنڈا مہم چھیڑ دی گئی۔ حکومت اور اس کے زرخرید علماء نے عوام کو مولانا مودودی کی انقلابی تحریروں سے برگشتہ کرنے کے لیے رکیک سے رکیک ہتھیار استعمال کیے۔ کبھی ان کے مضامین وتقاریر کے اقتباسات کو سیاق وسباق سے ہٹا کر الٹے سیدھے معنی پہنائے گئے اور اس پر فتوے حاصل کیے گئے؛ کبھی دعویٰ کیا گیا کہ یہ شخص مہدی ہونے کا دعویٰ کرنے والا ہے؛ کبھی ارشاد ہوا کہ یہ شخص صرف آدھے قرآن کو مانتا ہے؛ کبھی فرمایا گیا کہ یہ شخص صرف تین نمازوں کا قائل ہے۔ خارجی، معتزلی، کافر... اور نہ جانے کون کون سی علمی وغیر علمی گالیاں اس بطل جلیل کو دی گئیں جس نے اسلام کے احیا اور اس کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے رکھا تھا۔ مولانا مودودی نے علمی اعتراضات کے جواب ضرور دیے لیکن رفقاء کے بار بار اصرار کے باوجود شر پسند عناصر کے جاہلانہ پروپیگنڈے کا جواب دینے میں اپنی ذرہ برابر بھی توانائی خرچ نہیں کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب یہ لوگ مفت میں اپنی نیکیاں میرے کھاتے میں ڈالنے کو تیار ہیں اور میرے گناہ اپنے سر لے رہے ہیں تو میں بھلا بیوقوف تھوڑے ہی ہوں جو اس سے انھیں روکوں، مجھے تو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اسی شریفانہ طرز سے آپ نے سخت سے سخت مخالفت کا سامنا کیا۔ ایک شخص، جو اسی قسم کے پروپیگنڈے سے متاثر تھا، مولانا کی مجلس میں شریک ہوا تو ان کی دینی عظمت کا قائل ہو گیا، اس نے مجلس کے بیچ میں اپنا خنجر نکال کر رندھی ہوئی آواز میں عرض کیا، ''مولانا! میں تو آپ کو قتل کرنے آیا تھا''؛ مولانا مودودی نے اطمینان سے فرمایا، ''تو پھر قتل کر دو۔''

اکتوبر 1958 میں پاکستان میں مارشل لاء لگ گیا، تمام سیاسی جماعتوں بشمول جماعت اسلامی پر پابندی لگ گئی۔ پابندی کے ان ایام میں مولانا مودودی نے ان مقامات کے سفر کا قصد کیا جن کا ذکر قرآن میں آتا ہے تاکہ **تفہیم القرآن** کو بہتر طریقے پر لکھ سکیں۔ نومبر 1960 میں شاہ سعود کی درخواست پر آپ نے مدینہ کی اسلامی یونیورسٹی کا نقشہ تیار کیا۔ دسمبر 1961 میں مدینہ گئے جہاں ان کی یہ اسکیم چند جزوی وانتظامی قسم کی ترامیم کے ساتھ منظور ہوئی۔ چاروں فقہ کی تعلیم، اور دور جدید کی نمائندگی کرنے والے علماء کی تخریج اس خاکے کے بنیادی اجزاء تھے۔ اگلے برس آپ نے مدینہ یونیورسٹی کی مجلس شوریٰ میں بھی شرکت فرمائی۔ 18 مئی 1962 کو موتمر عالمی کا اجلاس ہوا، **رابطہ عالم اسلامی** کی تشکیل اسی اجلاس میں ہوئی، آپ اس میں بھی شریک رہے۔ بعد ازاں ستمبر

1967 میں مراکش کے شہر فاس کی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں شرکت کی... رباط میں مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس میں شاہ مراکش کی دعوت پر شریک ہوئے۔

جولائی 1962 میں سیاسی جماعتوں پر سے پابندی ہٹی تو جماعت اسلامی بھی فعال ہوگئی۔ 1956 کا دستور کالعدم قرار پایا اور فوجی حکمرانوں نے پاکستان کو نیا من مانا دستور دیا۔ 26 اگست کو راولپنڈی میں اپنی ایک طویل تقریر میں مولانا مودودی نے دستور کی ہر دفعہ کا تجزیہ کیا اور کہا کہ یہ دستور نہ جمہوری ہے اور نہ اسلامی۔ اکتوبر 1963 کو کل پاکستان اجتماع منعقد ہوا، حکومت نے خوب اڑنگے ڈالے۔ تنگ جگہ پر بغیر لاؤڈ اسپیکر کے اجتماع کی اجازت ملی۔ غنڈوں کے ذریعے اجتماع درہم برہم کرایا گیا۔ غنڈوں نے گولیاں تک چلائیں اور پولس کھڑی منہ دیکھتی رہی۔ حد تو یہ ہے کہ اسٹیج پر مولانا مودودی کا نشانہ لے کر فائر کیے گئے۔ لوگوں نے بار بار کہا ''مولانا بیٹھ جائیں، مولانا بیٹھ جائیں...'' لیکن مولانا مودودی نے صبر وسکون کے ساتھ فرمایا: ''**میں ہی بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہے گا۔**''

مولانا کی قیادت میں دستور کو اسلامیانے کی مہم چلتی رہی اور زور پکڑنے لگی۔ 6 جنوری 1964 کو جماعت پر پھر پابندی لگ گئی اور لیڈران گرفتار کر لیے گئے۔ 25 ستمبر کو سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد یہ پابندی ہٹی۔ 29 جنوری 1967 کو آپ پھر گرفتار ہوئے، لیکن اس بار جلد ہی چھوڑ دیا گیا۔ جنوری 1969 میں ایوب نے دفعہ 144 ختم کر دی، سیاسی رہنماؤں سے مذاکرت کا آغاز کر دیا، سیاسی قیدی رہا کر دیے۔ لیکن اب معاملہ بہت آگے بڑھ چکا تھا، 25 مارچ کو جنرل یحییٰ خان صدر بن بیٹھا، مولانا نے اسے 1956 کا آئین بحال کرنے کا مشورہ دیا۔ تشدد کی مسلسل وارداتوں، اخباری ہڑتالوں اور گھٹیا بیان بازیوں کے طوفان کے جواب میں مولانا نے اسلامی قوتوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے اتحاد کا مظاہرہ کریں اور 31 مئی کو یوم شوکت اسلام منائیں۔

اس دوران آپ کی صحت کافی متاثر رہی لہٰذا 4 نومبر 1972 کو تیس سال تک جماعت اسلامی کی قیادت کرنے کے بعد آپ بااصرار امارت کی ذمہ داریوں سے الگ ہوگئے۔ 28 فروری 1979 کو مولانا مودودی کو اسلام کی فکری وعملی خدمات کے اعتراف میں عالم اسلام کے پہلے شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔

کار جہاں بینی: مولانا مودودی کا لٹریچر جہاد بالقلم کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس لٹریچر نے لاتعداد زندگیوں کا رخ بدلا ہے۔ لوگوں کی نیندیں اڑادیں ہیں۔ اس لٹریچر میں نری جذباتیت نہیں ہے بلکہ عقلی استدلال ہے۔ اس لٹریچر نے اپنے منطقی تجزیے، بے لاگ تبصرے، اور شدومد کے ساتھ اسلام کو پیش کرنے کی بنا پر لوگوں کو (خصوصاً عام تعلیم یافتہ طبقے کو) اسلام سے قریب کیا، نہ صرف انھیں متاثر کیا بلکہ انھیں اسلامی کاز سے جوڑا، شہادت حق کے فریضے کی ادائیگی کے لیے آمادہ کیا اور اسلام کے تئیں ان کے معذرت خواہانہ رویہ کو خود اعتمادی سے لبریز کردیا۔ اسلام، مولانا کی تحریروں میں کوئی منجمد مذہب، رسومات کا مجموعہ، یا صرف فرد کی روحانی زندگی سے بحث کرنے والا ضمیمہ نہیں بلکہ ایک کل، ایک مکمل نظام حیات کی شکل میں زندہ اور قابل عمل نظر آتا ہے۔ خود مغربی مفکرین مولانا مودودی کو 'اسلامزم' کا بانی قرار دیتے ہیں۔ مولانا مودودی کی تحریروں کی ایک اور خاصیت ان کا تنوع اور معیار کی یکساں پاسداری ہے۔ کہیں زود نویسی نے ان کے معیار کو متاثر نہیں کیا اور کہیں معیار کے چکر میں ان کا قلم سست رو ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس کے پیچھے نہ صرف جذبہ اور ولولہ تھا بلکہ انتھک محنت اور جدوجہد تھی۔ آپ کی زندگی کا ایک لمبا عرصہ اس طرح گزرا کہ دن بھر جماعت کے کاموں میں مصروف رہنے کے بعد رات بھر مطالعہ، غور وفکر اور لکھنے کا کام کرتے رہے۔ حتیٰ کہ رمضان میں تراویح کے بعد جو قلم اٹھاتے تو پھر اہلیہ ہی آواز دیتیں کہ آیئے سحری کا وقت ہوگیا ہے۔ جس موضوع پر آپ کو لکھنا ہوتا اس پر آپ جانفشانی کے ساتھ مواد اکٹھا کرتے اور جب تک شرح صدر نہ ہوجاتا اس پر لکھنا شروع نہیں کرتے تھے۔ ایک بار جب ذہن میں گتھیاں سلجھ جاتی تھیں تو اشہب قلم کو کاغذ پر آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ شاید اسی تندہی، لگن اور خلوص کا نتیجہ ہے کہ ان کی متعدد کتابوں کے ترجمے دنیا کی ساٹھ ساٹھ زبانوں میں ہوچکے ہیں اور یہ تعداد روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ان کے قلم سے فیضیاب ہونے والے مغرب میں امریکہ اور کینیڈا سے لے کر مشرق میں انڈونیشیا اور ملیشیا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ عالم عرب اور برصغیر میں تو ان کی تحریریں حوالوں کے لیے چن ہی لی گئیں ہیں۔

مولانا مودودی کی شہرۂ آفاق تفسیر تفہیم القرآن کو ایک شاہکار کی حیثیت حاصل ہے، قرآن کو جدید تعلیم یافتہ ذہن سے جس طرح اس تفسیر نے قریب کیا ہے اتنا کسی اور تفسیر نے نہیں کیا۔ تفہیم القرآن نے، خطبات نے، رسالۂ دینیات نے... نہ جانے کتنے قلوب کو ہدایت کی روشنی سے منور کیا ہے، نہ جانے

کتنے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو صراط مستقیم پر لا کھڑا کیا ہے اور نہ جانے کتنے ذہنوں کی گرہیں کھولی ہیں۔ مولانا کی دیگر اہم تصانیف میں الجہاد فی اسلام، اسلام اور ضبط ولادت، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی، سود، اسلام اور جدید معاشی نظریات، تجدید واحیائے دین، حقوق الزوجین، سنت کی آئینی حیثیت، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، مسئلۂ قومیت، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، خلافت و ملوکیت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے مختلف خطبات ومقالات اور ریڈیائی تقریروں کے متعدد مجموعے کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں جن میں اسلام کا سرچشمۂ قوت، اسلام کا نظام حیات، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے، بناؤ اور بگاڑ، تنقیحات، تفہیمات، تعلیمات، دین حق، شہادت حق، سلامتی کا راستہ، رسائل ومسائل وغیرہ شامل ہیں۔ **الجمعیت** میں لکھے گئے ان کے اداریوں اور کالموں کے بھی کم سے کم چار مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ان کی سیاسی تحریریں **اسلامی ریاست** اور معاشی تحریریں **معاشیات اسلام** کے نام سے یکجا کی جا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی عصری مجالس (سوال وجواب)، انٹرویوز، خطابات و پیغامات کتابی شکل میں ہدیہ قارئین کیے جا چکے ہیں۔ سچ ہے ایک اپنے قلم کے بل بوتے پر ان گنت انسانوں کی زندگی میں تبدیلی لانے کی ایسی مثال تاریخ مشکل سے ہی پیش کر سکتی ہے... **ایں سعادت بزور بازو نیست!**

بجھتا چراغ، پھیلتی روشنی: 1972 میں تفہیم القرآن کی تکمیل کے بعد آپ نے خود کو سیرت سرور عالم کے لیے وقف کر دیا۔ لیکن افسوس کہ دو جلدوں کے بعد یہ سیرت مکمل نہ ہونے پائی۔ جماعت اسلامی کی امارت سے الگ ہونے کے بعد بھی قوم کے ایک بڑے بزرگ کی حیثیت سے آپ نے نہ صرف جماعت، نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔ شاہ فیصل نے انھیں سعودی شہریت دے کر اپنا مشیر خاص بنانا چاہا تو مولانا راضی نہ ہوئے البتہ یہ فرمایا کہ ایک مسلمان ہونے کے ناطے میں آپ کا ہمہ وقتی مشیر ہوں۔ آپ جب چاہیں اپنے سفیر کی وساطت سے یا فون پر مشورہ طلب کر سکتے ہیں۔

مارچ 1977 میں انتخابات میں دھاندلی ہوئی اور ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف احتجاجی مہم تیز ہوگئی، مولانا مودودی نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ انتخابات دوبارہ کرائیں۔ بھٹو نے اس مشورے پر کان نہ دھرا۔ بعد میں جب صورتحال زیادہ نازک ہوگئی اور اس کا اقتدار خطرے میں پڑ گیا تو وہ خود مولانا

مودودی سے 'مشورہ' کرنے ان کے گھر آیا، مولانا مودودی نے صاف صاف استعفیٰ کی مانگ کی اور کہا کہ اب حالات اس قدر خراب ہو چکے ہیں کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

مولانا مودودی کو شروع ہی سے گردے کی تکلیف تھی، جو بسا اوقات عود کر آتی تھی اور نا قابل برداشت ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن ملت اسلامیہ کے اس بہادر سپاہی نے جس طرح جیل، تختۂ دار اور ڈکٹیٹروں کا سامنا کیا اسی دیدہ دلیری سے اپنی بیماریوں کو بھی خاطر میں نہیں لائے۔ جیل میں ایک مرتبہ پتھری کی تکلیف بڑھی یہاں تک کہ سخت درد کے ساتھ پیشاب تک رک گیا تو آپ نے رو رو کر دعائیں مانگیں کہ یا اللہ اس تکلیف کو اپنے دست غیب سے ٹھیک کر دے کہ مجھے ان ظالموں سے کوئی مراعت طلب کرنے کی ضرورت نہ ہو، اللہ نے اپنے بندے کی سن لی، وہ پتھری اپنی جگہ سے ہٹ گئی، پھر ایک عرصے تک درد کی شکایت نہ ہوئی۔ اگست 1968 میں جب دوبارہ یہ شکایت ہوئی اور بڑھ گئی تو گردے کے آپریشن کے لیے امریکہ جانا پڑا۔ اخیر دنوں میں صحت کافی گر گئی تھی، پہلے بیٹھ کر نماز پڑھ لیتے تھے، دھیرے دھیرے چل لیتے تھے لیکن اب گھٹنوں کے درد کی شکایت بھی بڑھ گئی تھی۔ اپریل 1974 میں بیٹے کے اصرار پر علاج کے لیے پھر امریکہ گئے۔ بعد میں یہ تکلیف پھر عود کر آئی۔ 26 مئی 1979 کو پھر آپریشن کی غرض سے امریکہ گئے۔ بے ہوشی میں بھی وضو اور نماز جیسا کرتے تھے۔ 22 ستمبر کو انتقال فرمایا۔ تین براعظموں میں دس سے زیادہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ علامہ یوسف القرضاوی نے آخری نماز جنازہ لاہور میں پڑھائی، چھ سات لاکھ کا مجمع تھا۔ اللہ تعالیٰ بیسویں صدی کے اس پر آشوب دور میں تجدید و احیائے دین کا فریضہ نبھانے والے اس عظیم مفکر، عظیم قائد کی قبر کو نور سے بھر دے اور راہ حق کے جس عظیم الشان کارواں کو انھوں نے بطور میراث چھوڑا ہے اسے منزل پر پہنچنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!